بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

پنڈت جواہر لال کے جو خیالات گذشتہ اشاعت میں پیش کیے گئے ہیں ان کو محض ایک شخص کے ذاتی خیالات سمجھکر سرسری طور پر نظر انداز کر دینا صحیح نہیں ہے جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اب یہ پنڈت جی کے ذاتی خیالات نہیں ہیں بلکہ کانگریس کی سرکاری پالیسی کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ کانگریس نے مارچ ۳۷ء کے بعد سے جمہور مسلمین کے ساتھ ربط قائم کرنے کی جو تحریک (Muslim Mass Contact Movement) کے نام سے شروع کی ہے وہ ٹھیک ٹھیک انہی راستوں پر چل رہی ہے جو پنڈت جی نے تجویز کیے ہیں۔ پورا غیر مسلم پریس جو کانگریس کے زیر اثر ہے مسلمانوں میں اسلامی قومیت اور اسلامی تہذیب کے خلاف بغاوت پھیلانے میں لگا ہوا ہے۔ جس گوشے سے اس بغاوت کا کوئی اثر ظاہر ہوتا ہے، اس کا بڑے جوش کے ساتھ خیر مقدم کیا جاتا ہے، اور ہر اُس آواز کو جو اسلامی شعور کے تحت کسی مسلمان کی زبان سے بلند ہوتی ہے "فرقہ پرستی" اور "رجعت پسندی" کے آوازے کس کر دبا دیا جاتا ہے۔

اس طرز عمل کی توضیح کے لیے میں صرف دو مثالیں پیش کرونگا۔ مثالوں کی کمی نہیں ہے۔ اگر تحدی کی جائے تو ان کا ایک معتد بہ ذخیرہ میرے پاس محفوظ ہے جسے ضرورت کے وقت پیش کر سکتا ہوں مگر چونکہ میں بحث کو طویل نہیں دینا چاہتا، اس لیے صرف دو مثالوں پر اکتفا کرونگا جن سے اس تحریک کے رجحانات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے

ابھی چار پانچ مہینے ہوئے لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک مسلمان نژاد طالب علم نے برملا اعلان کیا تھا کہ میں مسلمان نہیں ہوں اور مسلمانوں نے اس پر یہ اعتراض کیا تھا کہ جو شخص خود اسلام سے منکر ہے وہ کسی انتخاب میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے امیدوار بننے کا حق دار کیسے ہو سکتا ہے اس واقعہ پر اظہار رائے کرتے ہوئے ایک انگریسی اخبار (ہندوستان ٹائمز) لکھتا ہے۔

"اگر ووٹروں کی فہرست میں نام درج ہونے اور انتخابات کے لیے بحیثیت امیدوار کھڑے ہونے سے پہلے لوگوں کے عقائد کی تحقیقات شروع ہو گئی تو ہمارا موجودہ انتشار و اختلال اور زیادہ پریشان کن ہو جائے گا۔ اس سے تو یہ بات بالکل عیاں ہو گئی کہ ہمارا یہ سارا انتخابی نظام جس کو ہمارے آقاؤں نے اس قدر کامل غور و فکر کے بعد مرتب کیا ہے اس وقت بیکار ہو کر رہ جائے گا جب کہ لوگ صرف ہندو یا مسلمان نہ رہیں گے بلکہ فرداً فرداً اپنے مخصوص عقائد اور شبہات پیدا کر لیں گے۔ لہٰذا مسٹر نقوی کو مستقبل کے لیے ایک فال نیک سمجھنا چاہیے اور کیا خبر کہ وہ آنے والی صبح صادق کے ایک پیغمبر ہوں"۔

اس مضمون میں انگلستان کے اُن ملاحدہ کو مثال میں پیش کیا گیا ہے جنہوں نے حریت فکر کا علم بلند کیا تھا اور اپنی مذہب پرست قوم کے ہاتھوں تکلیفیں اٹھائی تھیں، مثلاً چارلس بریڈلا، مارلے اور رابرٹ انگرسول۔ پھر اسلام سے بغاوت کرنے والے اس نوجوان کو ان "بہادروں" کی صف میں جگہ دے کر اس کی ہمت و جرأت پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے گئے ہیں۔

ایک دوسرا انگریسی اخبار (تیج) اپنی ۱۴ اگست ۳۷ء کی اشاعت میں ایک مسلمان عورت کا خط شائع کرتا ہے جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:۔

"جب میرٹھ میں پوجیہ پنڈت جواہر لال نہرو تشریف لائے تو میں اپنے خاوند سے چھپ کر

جلسہ دیکھنے گئی اس وقت سے میرا دل بے چین رہنے لگا میں نے اپنے مکان پر قومی جھنڈا لگا دیا لیکن جب میرے خاوند نے اسے پھاڑ ڈالا تو میں نے سارا دن نہ تو کھانا کھایا نہ رات کو سوئی بلکہ تمام رات اور دن برابر روتی رہی۔ جب میرے خاوند نے میرے پیارے پنڈت جواہر لال کو گالیاں دینی شروع کیں تو میں نے کہا اگر ان کی شان میں کچھ کہا تو جان کھو دوں گی۔ چنانچہ میں اسی دن لڑ کر اپنے باپ کے گھر چلی آئی ہوں۔ اب جبتک میرا خاوند معافی نہ مانگے گا اپنے مکان پر کانگریس کا جھنڈا نہ لگائے گا، اور کانگریس کا ممبر نہ بنے گا، میں اس کی شکل بھی نہ دیکھوں گی۔"

ایڈیٹر صاحب! میں نے پچاس مسلمان عورتیں تیار کر رکھی ہیں جو پردے کو چھوڑ کر ہر وقت کانگریس کا کام کرنے کو تیار ہیں۔ مگر ہمارے گھر والے ہمکو بہت تنگ کرتے ہیں۔

اب آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟ اور آپ ہمارے پوجیہ پنڈت جواہر لال سے کہیے کہ ہم مسلمان عورتیں کیا کریں؟"

بہت ممکن ہے کہ یہ خط فی الواقع کسی مسلمان عورت کا لکھا ہوا نہ ہو، اور محض ایک جعل ہو لیکن اگر یہ جعل ہے تو یہ اور بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ "لشکر آزادی" کے ان نقیبوں کے مافی الضمیر پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ "قوم پرستی" کے یہ علم بردار مسلمان مردوں اور عورتوں کو کیا دیکھنا چاہتے ہیں، "آزادی کی فوج" کے لیے کس قسم کے سپاہی ان کو مسلمانوں میں درکار ہیں، اور کم از کم کس حد تک اصول اسلام سے منحرف ہونا ضروری ہے جس کے بعد وہ کسی مسلمان کو "قوم پرست" تسلیم کر سکتے ہیں۔

یہ بغاوت صرف غیر مسلموں ہی کی زبان و قلم کے ذریعہ سے نہیں پھیلائی جا رہی ہے بلکہ خود مسلمان بھی اس کی اشاعت کے لیے آلہ کار بنائے جا رہے ہیں۔ مسلمان لیڈر، مسلمان اہل قلم اور مسلمان رسائل و جرائد

انہی تمام خیالات کو مسلمانوں میں پھیلانے کا وسیلہ بن گئے ہیں اور بنتے جا رہے ہیں جو پنڈت جواہر لال نہرو کی زبان سے آپ سُن چکے ہیں، اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو بہکانے کے لیے غیر مسلموں کی بہ نسبت خود مسلمان زیادہ کارگر ذریعہ بن سکتے ہیں۔

اس کے لیے آپ کو جتنی مثالوں کی ضرورت ہو، میں پیش کر سکتا ہوں۔ مگر یہاں صرف ان حضرات کی تحریروں سے استناد کروں گا جو کانگریس میں کوئی نہ کوئی "سرکاری" یا ذمہ دارانہ حیثیت رکھتے ہیں۔

بہار کے مشہور کانگریسی لیڈر ڈاکٹر سید محمود صاحب، جو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سکرٹری رہ چکے ہیں، اور اس وقت صوبۂ بہار کی وزارت میں واحد مسلمان وزیر ہیں، اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں:

"مختصر یہ کہ اخلاقی سیاسی اور دوسرے تمام حکیمانہ تصورات کو قطعیت اور عملیت کا جامہ پہنا کر مسلمانوں نے ہندوستان کے تخیل کو عمل کا آئینہ بنا دیا۔ بعض نے اپنے ولولہ و جوش سے مجبور ہو کر ہندوستان میں متحدہ قومیت کی آفرینش کے پیش نظر ایک ایسے جدید نظام مذہبی کی نشو و نما کرنی چاہی جو ہندوستان میں سب کے مناسب حال ہو۔ یہ ان لوگوں کی معمولی خدمات نہیں کہی جا سکتیں۔ اجنبی تھے، لیکن انہوں نے جلد ہی اپنی قسمتوں کو اہل ملک کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وابستہ کر لیا" (جامعہ۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء)۔

آپ سمجھے کہ یہ "جدید نظام مذہبی" کا اشارہ کس چیز کی طرف ہے؟ یہ اشارہ اکبر کے دین الٰہی کی طرف ہے۔ کتنا مختصر اشارہ ہے، مگر "قوم پرست مسلمان" ـــــ مجموعۂ ضدّین ـــــ کی معراجِ تخیل کو کتنی صاف روشنی میں پیش کرتا ہے۔ اکبر کا دور اسلامی ہند کی تاریخ میں پہلا دور ہے جس میں سیاسی اغراض پر مذہب کو قربان کرنے کی ابتدا ہوئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے تذکرہ میں اس نامبارک دور کے جو حالات بیان فرمائے ہیں ان کو پڑھیے تو آپ کو اس کی فتنہ سامانیوں کا اندازہ ہوگا۔ یہ پہلا فتنہ عظیم تھا جس نے پوری

طاقت کے ساتھ الحاد و بے دینی پھیلا کر ہندوستان کے مسلمانوں کو وطنی قومیت میں جذب کرنے کی کوشش کی۔ اُس دور کے تمام صلحاء امت اس فتنے پر چیخ اٹھے تھے۔ حضرت سید احمد مجدد سرہندی رحمہ اللہ نے اسی کے خلاف علم جہاد بلند کیا تھا۔ اسی ناپاک دور کے اثرات تھے جنہوں نے داراشکوہ کی صورت میں جنم لیا۔ اسی زہر کو دور کرنے کے لیے عالمگیر پچاس برس جدوجہد کرتا رہا اور یہی زہر آخر کار مسلمانوں کی سیاسی طاقت کو گھن کی طرح کھا گیا۔ مسلمانوں میں قوم پرستی کی جدید تحریک دراصل اسی پرانی تحریک کی نشاۃ ثانیہ ہے، لہٰذا یہ لوگ اس فتنۂ عظیم کو فتنے کی حیثیت سے نہیں بلکہ "خیر القرون" کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور وسوسہ (Inspiration) حاصل کرنے کے لیے اُسی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک متحدہ قومیت کی آفرینش کا یہ پہلا تجربہ، ہندوستانی مسلمان کی "خدمات" میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ ان کے ذہن میں "متحدہ قومیت" کا تصور یہی ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنی قسمتوں کو اسی طرح اہل ملک کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وابستہ کر لیں۔

پنڈت جواہر لال بھی اس کے سوا کچھ نہیں چاہتے۔

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب اپنے اس مضمون میں فرماتے ہیں:۔

"سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں آخر ہمارا نصب العین اور مقصد کیا ہے؟ کیا ہم اس سمت میں قدم اٹھانے کو آمادہ ہیں کہ ایک مشترک قومیت کی معہ تمام لوازم کے تشکیل کریں؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو یہ بالکل ظاہر ہے کہ ہندوستان صرف ایک جغرافیائی نام ہے جس میں ایک سے زیادہ "اقوام" بستی ہیں۔ کیا ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہر "قوم" علیحدہ علیحدہ اپنے مسائل کو حل کرے اور مشترکہ دولت ہند (COMMAN WEALTH) میں صرف انسانی اور مادی امداد کیا کرے؟ اگر مسئلہ ہند کا یہی حل ہے تو ہماری اس وقت تک کی کوششیں اس کے برعکس

بالکل ناکام رہی ہیں.....

لیکن اگر ہمارے سوال کا جواب اثبات میں ہے اور ہم واقعی یہ چاہتے ہیں کہ ہم اسی راہ پر گامزن ہوں جو اکبر اور دوسرے ازمنۂ وسطیٰ کے حکمرانوں نے بنا دی تھی تب تو ہمیں غرم و استقلال کے ساتھ ہمیشہ نہ صرف اسی راہ پر چلنا چاہیے بلکہ ہمارے پیشے اور رسوم میں بھی یکسانیت ہونی چاہیے۔ بعض کے نزدیک تو اس حل میں بھی مسلم اقلیت کے لیے ایک مضرت ہے لیکن اس کا کوئی چارۂ کار نہیں۔ اور چونکہ کوئی تیسرا حل موجود نہیں ہے اس لیے مسلمانوں کو ملک کی خاطر اور اپنی خاطر اسے قبول کرنا چاہیے۔

یہاں مافی الضمیر بالکل واضح ہو گیا ہے۔ صوبۂ بہار کے چالیس لاکھ مسلمانوں کی قسمتیں جس شخص کیساتھ وابستہ ہیں، جسے بہار کی وزارت میں ہماری آئندہ نسلوں کی تعلیم کا نگران بنایا گیا ہے، وہ سرے سے اس تخیل ہی کا مخالف ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی کوئی مستقل "قومیت" باقی رہے، اور آزاد ہندوستان میں ان کو ایک ممتاز اجتماعی وجود کی حیثیت سے اپنے مسائل خود حل کرنے کا موقع حاصل ہو۔ اس کا نصب العین ہمارے نصب العین سے بالکل مختلف اور جواہر لال نہرو کے نصب العین سے بالکل متحد ہے۔ ہم آزادی اس لیے چاہتے ہیں کہ ڈیڑھ سو برس کے غیر مسلم اقتدار نے ہماری قومیت اور ہماری تہذیب کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی کر سکیں۔ اور وہ آزادی اس لیے چاہتا ہے کہ اب تک جو نقصان ہمیں پہنچا ہے، آگے چل کر وہ اپنے طبعی نتیجہ کو پہنچ جائے، یعنی ہماری مضمحل شدہ قومیت ہندوستان کی مشترک قومیت میں جذب ہو جائے، ہماری تہذیب کی کوئی امتیازی شان باقی نہ رہے، ہمارے مختلف پیشوں کے لوگ اپنے اپنے ہم پیشہ غیر مسلموں کے ساتھ گھل مل جائیں اور ان کے درمیان پیشوں کے ساتھ "رسوم میں بھی یکسانیت" پیدا ہو جائے۔ ہندوستان کی مختلف قوموں کے لیے لفظ "اقوام" کا استعمال ہی فاضل ڈاکٹر کے نزدیک قابل اعتراض ہے۔ وہ ہندوستان کو ایک جغرافی نام نہیں بلکہ ایک قومی وحدت بنانا چاہتے

ہیں۔ ان کے نزدیک مسئلہ ہند کا یہ حل بالکل غلط ہے کہ "ہر قوم علیحدہ علیحدہ اپنے مسائل کو حل کرے اور مشترکہ دولت ہند میں صرف انسانی اور مادی امداد کرے"۔ برعکس اس کے صحیح حل یہ ہے کہ "مسلمان اسی راستہ پر گامزن ہوں جو اکبر اور ازمنۂ وسطیٰ کے حکمرانوں نے بنا دی تھی"، یعنی ہندوستان کی کان نمک میں نمک بننے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اور یہ سب کچھ مسلمانوں کو کیوں کرنا چاہیے؟ خدا اور رسول کی خاطر نہیں، بلکہ ملک کی خاطر اور اپنی خاطر ——— غالباً یہاں "اپنے پیٹ کی خاطر" لکھنے میں ڈاکٹر صاحب کو شرم محسوس ہوئی ہوگی۔ ایں ہم غنیمت است!

کیا جواہر لال نہرو کا تصور قومیت اس سے کچھ بھی مختلف ہے؟

مسلمانوں کو اپنے نام "مسلم" پر بڑا فخر ہے۔ خدا کا رکھا ہوا نام، اور وہ نام جس سے بڑھ کر عزت و افتخار کا نام آج تک دنیا کی کسی قوم کو نصیب نہیں ہوا۔ مگر ڈاکٹر سید محمود صاحب کے نزدیک اس علیحدہ نام سے مسلمانوں کا موسوم ہونا قابل اعتراض ہے۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی اور اس قسم کے دوسرے تمام اسماء ان کے نزدیک محو ہو جانے چاہئیں اور صرف ایک نام "ہندی" تمام باشندگان ہند کے لیے استعمال ہونا چاہیے تاکہ جداگانہ قومیتوں کا احساس ہی باقی نہ رہے۔ فرماتے ہیں:

"لفظ "ہندی" کو زبان کے لیے نہیں بلکہ "اہل ہند" کے لیے اختیار کرنا چاہیے۔ دنیا بھر میں صرف ہمارا ملک ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں لوگ مختلف مذاہب سے شناخت میں آتے ہیں۔ صرف اس کا اظہار ہی ہماری دماغی کیفیت کا آئینہ بن جاتا ہے اور ہمارے متعلق یہ ثابت کر دیتا ہے کہ ہم اس برّاعظم کی علیحدہ علیحدہ "مذہبی اقوام" ہیں اسی لیے اب وقت آگیا ہے کہ ہم سب ایک مشترک نام اختیار کر لیں"۔

"ہم علیحدہ علیحدہ مذہبی اقوام ہیں"۔ یہ گویا ہمارے دامن پر ایک شرمناک دھبہ ہے جسے مٹا دینے کی

وستان
ضرورت ہے! وہ دماغی کیفیت ہی لائق صد شرم و ندامت ہے جس کے تحت دنیا کے اس اکیلے ملک ہند
دوزخ نشان کے باشندے مختلف مذاہب سے شناخت میں آتے ہیں!! یہ ثابت ہوجانا کہ ہم اس برّ اعظم
کی علٰحدہ علٰحدہ مذہبی اقوام ہیں، گویا اس بات کا ثابت ہوجانا ہے کہ ہم دورِ وحشت کی یادگار ہیں، اور اس
تلخ حقیقت کو شیرینی یا کم از کم فریب شیرینی سے بدل دینے کے لیے اب ناگزیر ہوگیا ہے کہ ہم ان ناموں
کو بدل ڈالیں جو "علٰحدہ مذہبی اقوام" ہونے کے احساس کو زندہ رکھتے ہیں ـــــ یہ ہیں اُس زعیم قوم
کے خیالات جس کو مولانا ابوالکلام آزاد نے صوبہ بہار کی وزارت میں ۴۰ لاکھ مسلمانوں کی نمائندگی کے
لیے منتخب فرمایا ہے[1]، اور جو بجنور کی انتخابی مہم میں مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے مولٰنا حسین احمد صاحب کیساتھ
دوش بدوش کام کرتا نظر آتا ہے۔ سچ فرمایا اللہ تعالٰی نے اپنی کتاب حکیم میں کہ اصل محرومی آنکھوں کا بصارت
سے محروم ہوجانا نہیں ہے بلکہ ان دلوں کا بصیرت سے محروم ہوجانا ہے جو سینوں میں پوشیدہ ہیں فَاِنَّهَا
لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ۔

جو لوگ جناح کی فرنگیت اور بے دینی پر بڑھ بڑھ کر اعتراض کرتے ہیں ان کے جوش دینداری کو دیکھ کر ہماری زبان سے بے اختیار مرحبا نکلتی ہے۔ مگر جب اسی لمحہ میں وہ اِن خیالات کی تبلیغ کرنے والوں کے ساتھ اشتراک عمل کرتے نظر آتے ہیں، اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے لوگوں کے ساتھ اشتراک عمل کرنے کے باوجود جناح پر طعن کرتے ہوئے انھیں شرم بھی نہیں آتی تو ہم حیران ہوکر پوچھتے ہیں کہ یارب! یہ کیا تماشا ہے؟ یہ دینداری ہے یا سیاسی دھڑے بندی اور عصبیت جاہلیت؟ جناح فرنگی اور بے دین ہی

---

[1] اس موقع پر مولانا ابوالکلام کے تذکرہ میں ان علماء و مشائخ کے حالات پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے جنہوں نے دور اکبری میں سیاسی اغراض پر دین کی قربانی چڑھانے والوں کے ساتھ مداہنت برتی تھی۔ ان لوگوں کے متعلق مولٰنا نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ ان شاء اللہ ازدیاد بصیرت کے موجب ہوں گے۔

مگر کونوا عِبَادَ اللہِ اِخْوَاناً کی آواز تو بلند کر رہا ہے۔ اس کو تو مطعون کیا جاتا ہے محض اس بنا پر کہ نہ اس کی صورت اسلامی ہے نہ سیرت اسلامی۔ مگر یہاں سیرت و صورت دونوں غیر اسلامی ہیں اور اُس کے ساتھ یہ صدا بھی بلند کی جارہی ہے کہ تعالوا الیٰ کلمۃ سواءٍ بیننا وَبَیْنَ الْکُفَّارِ وَالمشرکین۔ یہاں عود الی الجاہلیۃ الْاُولیٰ کی طرف دعوت دی جارہی ہے اور سیاسی اغراض کے لیے ملت ابراہیمی کا نام تک مٹادینے کی فکر ہے۔ اس کے باوجود آزادی ہند کے ان داعیوں کے ساتھ اشتراک عمل کیا جاتا ہے اور ان کا اعتبار مسلمانوں میں قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ یہ انگریزی اقتدار کی جڑ کھودنے سے پہلے محمد رسول اللہ کے نخل آرزو کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں!

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

یہ تو صرف ایک نظیر تھی کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ بس یہ ایک ہی نظیر ہے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے حال ہی میں ایک مستقل شعبۂ اسلامیات قائم کیا ہے جس کے کارکن مسلمان ہیں، اور نشر و اشاعت کے آلۂ کار سب کے سب مسلمان اخبارات ہیں۔ مسلمانوں کے لیے کانگریس نے جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں ان کی فہرست میں اس شعبۂ اسلامیات کے قیام کو بھی ایک نمایاں جگہ دی جاتی ہے، چنانچہ جمعیت علماء ہند کا واحد ترجمان "الجمعیت" اس خدمت جلیلہ کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

"دورِ جدید میں مسلمانوں نے شکایت کی کہ کانگریس عام مسلمانوں سے ربط نہیں رکھتی۔ اسلامی جرائد نے اس شکایت کو پیش کیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کی معقولیت کو تسلیم کیا اور محض مسلمانوں کی دل دہی اور سہولت کار کے لیے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے

ماتحت اسلامیات کا ایک مستقل شعبہ کھول دیا" (الجمیعۃ مورخہ ۵ رمضان ۵۶ھ)۔

بیچارے ناواقف عوام جب ان الفاظ کو دیکھیں گے تو کہیں گے کہ کیسی مہربان ہے یہ کانگریس! اس نے آج تک کوئی شعبۂ ہندویات وسکھیات وپارسیات نہیں کھولا، مگر ہماری "دلدہی" اس کو یہاں تک منظور ہے کہ خاص ہمارے لیے ایک شعبۂ اسلامیات کھول دیا۔

اب ذرا اس شعبہ کی کارگذاری ملاحظہ ہو۔

ڈاکٹر محمد اشرف صاحب (معتمد شعبۂ اسلامیات) کا ایک مضمون الجمیعۃ ہی میں ۱۸ رجب ۵۶ھ کی اشاعت میں درج ہوا ہے، اور ادارہ کی جانب سے اس پر کوئی تردیدی نوٹ یا اختلافی اشارہ تک نہیں ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:-

"ہندوستان میں سیاسی اور اقتصادی حالات اس درجہ ترقی کر گئے ہیں اور فضا کا تقاضہ اس درجہ شدید اور انقلاب انگیز ہے کہ رجعت پسندوں اور سامراج پرستوں کی یہ ہمت نہیں ہوتی کہ علانیہ کانگریس یا آزادی کی جدوجہد کی مخالفت کریں اس لیے ملک کو پیچھے لے جانے والی طاقتیں اور سامراج کی حامی جماعتیں کسی تعصب کی آڑ لیتی ہیں۔ گذشتہ سات آٹھ سال میں جب کبھی سیاسی یا سماجی ترقی کے لیے قدم بڑھایا گیا، ہندو مسلم سوال ضرور چھیڑ دیا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ جب ابتدائی تعلیم کے متعلق کانگریسیوں نے صوبہ متحدہ کی کونسل میں ایک زمانہ میں سوال چھیڑا تو رجعت پسند مسلمانوں نے فوراً مذہبی تعلیم و تربیت کا سوال شروع کر دیا اور ڈاکٹر ضیاء الدین اور دوسرے لوگ اس موقع پر کونسل چھوڑ کر چل دیے۔ سارداایکٹ کے خلاف جو ہندو اور مسلمان قدامت پسندوں نے ہنگامہ کیا وہ سب کو معلوم ہے..... ترقی پسندی کی طرح رجعت پسندی بھی ہماری پبلک زندگی کے ہر پہلو پر

محاذ قائم کرنا چاہتی ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی بوسیدہ خود فنا نہیں ہوتا۔ بڑھتی ہوئی سماجی قوتیں جدوجہد کے بعد اسے معزول کر دیتی ہیں"۔

غور فرمائیے مسلمان بچوں کے لیے تعلیم کی کسی اسکیم میں مذہبی تعلیم و تربیت کا مطالبہ کرنا رجعت پسندی ہے، سامراج کی حمایت ہے، ملک کو پیچھے لے جانے والی طاقتوں کا کام ہے۔ فضا کا انقلاب انگیز تقاضا اب یہ ہے کہ اس "بوسیدہ" چیز کو بڑھتی ہوئی سماجی قوتیں جدوجہد کے بعد معزول کر دیں۔ اور یہ سارداایکٹ کا تذکرہ اس سلسلہ میں کتنا برمحل آیا ہے۔ اگرچہ اس "ترقی پسند" قانون کی مخالفت "الجمعیۃ" نے اس وقت کی تھی جب اس کا ایڈیٹر ایک "رجعت پسند" شخص تھا، مگر اس رجعت پسندی میں خود جناب مولانا کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب اور تمام ارکان جمعیت علماء ہند (یعنی اِس وقت جو حضرات فضا کے شدید انقلاب انگیز تقاضوں سے متاثر ہو کر "ترقی پسند" بن گئے ہیں) اس کے ہم نوا تھے۔

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب یہ بحث شروع کرتے ہیں کہ کانگریس کی شرکت کے سلسلہ میں مسلمانوں کی تہذیب اور روایات کا سوال جو اٹھایا جا رہا ہے، یہ دراصل ترقی پسند اور انحطاط پذیر قوتوں کی کشمکش کا ایک عکس ہے ــــ "ترقی پسند" اور "انحطاط پذیر"، ان دو اصطلاحوں کا مفہوم جواہر لال اور ان کے شعبۂ اسلامیات کی لغت میں جو کچھ ہے اس کی تشریح میں بعد میں عرض کروں گا ــــ یہاں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ "ترقی پسند" قوتیں اسلامی تہذیب کے سوال کو کس نظر سے دیکھتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

"یہ صحیح ہے کہ مسلمان ایک مخصوص تہذیب کے حامل رہے ہیں۔ باوجود اختلافات اور تنوع کے ان میں ایک قسم کی یگانگت اور یکسانیت پائی گئی ہے۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ مسلمانوں کی زبان ایک تھی یا تمدن کے مظاہر ایک سے تھے، لیکن تاریخی طور پر کسی حد تک

صحیح ہے کہ مسلمان حکمران طبقہ کے رجحانات ایک سمت کی طرف دکھائی پڑتے ہیں۔

لوگ اسلامی تہذیب پر بحث کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ اس تمدن اور تہذیب نے ایک خاص ماحول میں تربیت پائی تھی اور بہرصورت مسلمانوں کی حکمران حیثیت سے وابستہ تھی۔ جو لوگ بے صبری کے ساتھ اسلامی تہذیب کی خصوصیات گناتے وقت یہ حدیث سناتے ہیں کہ کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہٖ۔ وہ اکثر یہ واقعہ بھول جاتے ہیں کہ یہ حدیث یا اس قسم کے دوسرے اقوال اس زمانہ کے سماجی حالات کا عکس ہیں جب انسانوں کی تقسیم حاکم اور محکوم، راعی اور رعیت میں ہوتی تھی اور مسلمان من حیث القوم حکمران تھے۔..........

البتہ اسلامی تمدن اور تہذیب کا مفہوم اس درجہ محدود نہ تھا جیسا آج کل ہوگیا ہے آج اسلامی تہذیب کی زندگی خطرہ میں پڑ جاتی ہے اگر مسلمان بجائے کلاہ اور عمامہ کے گاندھی ٹوپی پہننے لگتے ہیں یا ہندی رسم الخط کے پرچار کے لیے دو چار منہ واڈھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک خاص قسم کا لباس اگر نہ پہنیے یا اگر فصیح و بلیغ اردو نہ بولیے تو آپ کا تمدنی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ مذہبی حیثیت سے بھی مسلمان رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ معیاری اور ٹکسالی مسلمان صرف وہ خوش نصیب لوگ ہیں جو دہلی اور لکھنو کی فضا میں پلے اور بڑھے ہیں (چاہے وہ کایستھ یا کشمیری برہمن ہی کیوں نہ ہوں) یا پھر دیوبند اور فرنگی محل کا لباس پہننے والے اور علماء کی وضع کے پابند لوگ"۔

دیکھا آپ نے "ترقی پسندوں" کے علم و فضل اور ان کی دانش و بینش کا معیار کس قدر بلند ہے! ان کے ارشادات جب ہم پڑھتے ہیں تو بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے پنڈت جواہر لال نہرو نے

اپنی آواز کو ایک ریکارڈ میں بھر دیا ہے، اور وہی ریکارڈ جگہ جگہ بجتا پھر رہا ہے۔ اپنے شیخ طریقت، پنڈت جواہر لال کی طرح یہ لوگ بھی اسلامی تہذیب و تمدن کے مسئلے پر اظہار خیال کر کے درحقیقت اپنی بے علمی کا راز فاش کرتے ہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف اسلامی تہذیب و تمدن ہی سے نابلد نہیں ہیں، بلکہ نفس تہذیب و تمدن کے مفہوم سے بھی ناآشنا ہیں ـــ یا اگر ناآشنا نہیں ہیں تو عمداً غلط مبحث کر کے مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ تہذیب نام رکھتے ہیں تمدنی مظاہر کا، حکمران طبقے کے آداب و اطوار کا، لباس کی وضعوں اور کھانوں اور مٹھائیوں کا، اور اظہار ما فی الضمیر کے وسائل کا۔ پھر ان تمدنی مظاہر میں گردش ایام کے ساتھ جو تغیرات رونما ہوتے ہیں ان کے درمیان یہ کوئی امتیاز نہیں کرتے کہ کونسے تغیرات ایک تہذیب کے زیر اثر ہوئے اور کونسے دوسری تہذیب کے زیر اثر۔ بس سطح پر چند تغیرات دیکھ کر یہ اپنی تقریر شروع کر دیتے ہیں کہ دیکھو، تاریخ کے دوران میں تمہارا تمدن بارہا بدل چکا ہے، اور جب تمدن بدلا ہے تو گویا تہذیب بدل گئی ہے، لہٰذا اسلامی تہذیب و تمدن کسی متعین حقیقت کا نام نہیں ہے جس طرح پہلے تم بہت سے تغیرات قبول کر چکے ہو اسی طرح اب بھی اُن تغیرات کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ جن کا تقاضا، فضا کے انقلاب انگیز حالات یا بالفاظ دیگر جواہر لال اور ان کی امت کے رجحانات کر رہے ہیں ـــــ حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ علانیہ ایسی صریح جاہلانہ باتیں لکھنے اور شائع کرنے کی جرأت کیسے کرتے ہیں۔ کیا انہوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ سارا ہندوستان بس جہلا ہی سے آباد ہے اور یہاں کوئی پڑھا لکھا آدمی نہیں رہتا؟

اگرچہ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے مگر میں عام ناظرین کی واقفیت کے لیے بطور جملہ معترضہ صرف اتنا عرض کیے دیتا ہوں کہ دراصل تہذیب اُس طریق فکر، اُس نظریۂ حیات، اور اُس معیار امتیاز و

انتخاب کا نام ہے جو انسانوں کی کسی معتد بہ جماعت کے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتا ہے، اور جس کے زیر اثر وہ جماعت دنیا میں زندگی بسر کرنے کے مختلف طریقوں میں سے کسی خاص طریقے کو اختیار کرتی ہے۔ اور تمدن اُس خاص طرز زندگی کا نام ہے جو اسی تہذیب کے اصول و قواعد کے مطابق اختیار کیا جائے۔ ہم جس چیز کو اسلامی تہذیب کہتے ہیں وہ لکھنؤ اور دلّی کی فصیح و بلیغ اردو اور دیوبند و فرنگی محل کے علماء کا لباس نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس ذہنیت، اس طرز خیال اور ان اصول حیات پر مشتمل ہے جو قرآن اور سیرت رسول سے ماخوذ ہیں۔ جب تک کوئی تمدن اس تہذیب کے حدود کے اندر رہے، وہ اسلامی تمدن ہے، خواہ اس کی زبان، اس کے آداب و اطوار، اس کے کھانوں اور مٹھائیوں اور اس کے لباس و طرز معاشرت میں کتنے ہی تغیرات واقع ہو جائیں۔ مظاہر کا تغیر بجائے خود کسی تمدن کو اسلامی تہذیب کے دائرے سے خارج نہیں کر دیتا، البتہ جب وہ اس نوعیت کا تغیر ہو کہ اسلامی تہذیب کے اصول و قواعد میں اس کے لیے کوئی سند جواز نہ ہو، تو یقیناً وہ تمدن کو غیر اسلامی تمدن بنانے کا موجب ہوگا۔ مثال کے طور پر مسلمان مشرق سے لے کر مغرب تک بیسیوں طرح کے لباس پہنتے ہیں مگر ان سب میں ستر عورت کے انہی حدود کا لحاظ رکھا جاتا ہے جو اسلامی تہذیب نے مقرر کر دیے ہیں۔ لہٰذا یہ سب لباس اپنے تنوعات کے باوجود اسلامی تمدن ہی کے لباس کہے جائیں گے۔ مگر جب کوئی لباس ان حدود سے قاصر ہوگا تو ہم اسے غیر اسلامی لباس کہیں گے۔ اسی طرح غذا کے متعلق حلال و حرام کے جو حدود اسلامی تہذیب نے مقرر کیے ہیں ان کے تحت خواہ کتنی ہی انواع و اقسام کے کھانے مسلمانوں کے گھروں میں پکتے ہوں اور تاریخ کے دوران میں ان کی نوعیتیں کتنی ہی بدل جائیں، اور کھانے کے طریقوں میں کتنا ہی تغیر رونما ہو جائے ان سب کو اسلامی تمدن ہی کے دائرہ میں جگہ ملے گی، البتہ جب مسلمانوں کی غذا حدود حلّت سے متجاوز ہو گی تو ہم کہیں گے کہ وہ اسلامی تہذیب و تمدن سے بغاوت کر رہے ہیں۔ اسی پر زندگی کے تمام معاملات کو قیاس کر لیجیے۔

اب آپ غور فرمائیں کہ پنڈت جواہر لال اور ان کے یہ مسلمان متبعین اسلامی تہذیب و تمدن کے مسئلے کو

کیسی غلط روشنی میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ دنیا کو اور خود ناواقف مسلمانوں کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ "اسلامی تہذیب و تمدن فی نفسہ کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ صدیوں پہلے مغلوں اور پٹھانوں کے دور حکومت میں جو طور طریقے مسلمانوں میں رائج ہو گئے تھے انہی کا نام اسلامی تہذیب و تمدن رکھ دیا گیا ہے، اور جو مسلمان اسلامی تہذیب و تمدن کے تحفظ کا شور مچا رہے ہیں، ان کا مقصد محض اُس گزرے ہوئے تاریخی دور کی میراث کو ہی بدلے ہوئے زمانہ میں جوں کا توں برقرار رکھنا ہے، اس لیے یہ رجعت پسند اور ترقی دشمن ہیں"۔ ایک پوری قوم کے نقطۂ نظر کی غلط ترجمانی شاید ایسی بے حیائی کے ساتھ تو یورپ کے سیاسی بازی گروں نے بھی نہ کی تھی، جیسی کہ یہ ہمارے ہم وطن اور ہم قوم کر رہے ہیں۔ ان کو اگر معلوم نہیں ہے تو ہم انہیں بتانا چاہتے ہیں کہ ہم اُس تمدن کی حفاظت کے لیے نہیں اٹھے ہیں جو کسی زمانہ میں حکمراں طبقہ کے رجحانات سے پیدا ہوا تھا، بلکہ ہم اس لیے اٹھے ہیں کہ ہماری قوم کا تمدنی ارتقاء قرآنی تہذیب کے راستہ سے منحرف نہ ہونے پائے۔ ہمیں دلّی اور لکھنؤ کی ٹکسالی اردو کو بچانے کی فکر نہیں ہے، بلکہ اُس ذہن کو اسلامی ذہن رکھنے کی فکر ہے جس نے اپنی شخصیت ظاہر کرنے کے لیے اس زبان کو وسیلہ بنایا ہے۔ ہم دیوبند اور فرنگی محل کے لباس کو محفوظ رکھنے کے لیے نہیں لڑ رہے ہیں بلکہ ہم اس لیے لڑنا چاہتے ہیں کہ ہمارے مرد اور ہماری عورتیں اُس لباس حیا سے خارج نہ ہو جائیں جو اسلامی تہذیب نے انہیں پہنایا ہے۔ اور اس لڑائی کی ضرورت ہمیں اسلیے پیش آئی ہے کہ ہم ہندوستان کی سیاست پر تم جیسے لوگوں کو غالب آتے دیکھ رہے ہیں جن میں ہماری تہذیب کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں، جن میں اتنی راست بازی و انصاف پسندی نہیں کہ دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کریں، اور جن میں ان کمزوریوں کے ساتھ ہٹلر اور مسولینی کی فاشسٹی روح گھس گئی ہے کہ اپنی مرضی کو دوسروں پر مسلط کرنے کے لیے کسی طاقت کے استعمال سے دریغ نہیں کرتے خواہ اس کے استعمال میں صداقت، انسانیت اور اخلاق کو قربان ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

خیر یہ ایک ضمنی بحث تھی۔ یہاں میں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ کانگریس کا یہ شعبہ اسلامیات جو ہماری "دلدہی" اور "سہولت کار" کے لیے قائم کیا گیا ہے، دراصل کیا خدمات انجام دے رہا ہے۔ اسلامی تہذیب و تمدن کے متعلق پنڈت جواہر لال نہرو کے خیالات آپ پہلے پڑھ چکے ہیں ان کو مسلمان مضمون نگاروں اور مسلمان اخباروں کے ذریعہ سے مسلمانوں کے دلوں میں اتارنا اس کا مقصد ہے، اور آپ نے دیکھ لیا کہ یہ شعبہ جو ہماری "دلدہی" کے لیے قائم کیا گیا ہے اس مقصد کو کس خوبی کے ساتھ پورا کر رہا ہے۔ وہ ہمیں یہ سمجھا رہا ہے کہ یہ تہذیب جس کی حفاظت کا تم دعویٰ کر رہے ہو، کوئی چیز بھی تو نہیں ہے۔ مسلمان حکمران طبقہ کے رجحانات تھے سو وہ طبقہ ہی ختم ہو گیا۔ ایک خاص ماحول میں اس تہذیب نے تربیت پائی تھی، سو وہ ماحول ہی اب باقی نہیں۔ اب لے دے کے تمہاری تہذیب یہ رہ گئی ہے کہ ایک خاص وضع کا لباس پہن لیتے ہو اور ٹکسالی اردو بول لیتے ہو، تو وہ بھی دلی اور لکھنؤ تک محدود ہے اور دلی و لکھنؤ میں بھی وہ کوئی خاص تمہاری چیز نہیں ہے بلکہ کایستھ اور کشمیری برہمن بھی تمہارے ساتھ شریک ہیں۔ کیا اسی مہمل چیز کو تم فضا کے انقلاب انگیز تقاضوں اور سیاسی و اقتصادی حالات کی ترقی کے مقابلے میں بچانا چاہتے ہو؟ یہ تو عین رجعت پسندی ہے کیونکہ وہ دور گذر چکا جس میں یہ تہذیب پیدا ہوئی تھی۔ اور یہ سامراج پرستی بھی ہے کیونکہ فضا کے انقلاب انگیز تقاضوں کے مقابلہ میں اس بوسیدہ چیز کی حفاظت صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ تم سامراج کی حمایت کرو اور سامراج تمہاری حمایت کرے!

مسلمانوں کو شکایت تھی کہ کانگریس عام مسلمانوں سے ربط نہیں رکھتی۔ اس شکایت کی معقولیت تسلیم کر کے کانگریس نے کیسے معقول طریقہ سے اسے دور کیا ہے!

ڈاکٹر اشرف صاحب کا وعظ ابھی ختم نہیں ہوا۔ آگے سنیے:۔

"جاگیرداروں اور عہد بادشاہت کے زمانہ میں باعتبار زبان، لباس، تمدن بلکہ مذہبی عقائد کے لحاظ سے بھی مسلمانوں میں کوئی یکسانیت نہ تھی۔ عربی، فارسی، ترکی، تاتاری، چینی سب مسلمانوں کی زبانیں تھیں۔ مغربی، مشرقی، ایرانی، رومی، ہندی، ہر طرح کے لباس مسلمانوں کے ہر طبقہ میں رائج ہو چکے تھے۔ چنانچہ جب ہمایوں ہندوستان سے جلا وطن ہو کر ایران پہونچا تو شاہ ایران نے بجائے ایرانی کھانوں کے اپنے مہمان کے لیے خاص طور پر ہندوستانی مٹھائیاں اور کھانے تیار کرائے۔ عقائد کی یکسانیت کا تو مسلمانوں میں سرے سے کوئی سوال ہی نہیں، بہتر فرقے ضرب المثل ہیں"۔

کچھ غور بھی کیا آپ نے کہ یہ تنوع کی تمام مثالیں کس مقصد کے لیے پیش کی جا رہی ہیں؟ اس کا مقصد یہ ہے کہ جب اتنی زبانیں بول کر، اتنے مختلف لباس پہنکر ایران میں ہندوستانی مٹھائی کھا کر، بہتر فرقوں میں بٹ کر، اور عقائد میں یکسانیت سے یکسر محروم ہو کر بھی تم مسلمان رہے تو اب اگر تم گاندھی کیپ اور دھوتی پہن لو، تمہاری عورتیں سماجی خدمت (Social Service) کے لیے گھروں سے باہر نکل آئیں، تم نئی "ہندوستانی" زبان بولنی اور لکھنی شروع کر دو، مخلوط تعلیم گاہوں میں تمہارے لڑکے اور تمہاری لڑکیاں "جدید طرز کی تعلیم" حاصل کرنے لگیں، سیاسی معاشرتی اور معاشی انقلاب کی جدید تحریکات تم میں پھیلنے لگیں تو اس میں کونسا مضایقہ ہو جائیگا؟ ——— اسی مقصد کو چھپا کر ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے:۔

"اس اعتبار سے آج ہم ایک نئے اور زندہ تمدن کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ ہماری سیاسی اور سماجی جد و جہد اس نئے تمدن کا پیش خیمہ ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم اس نئی تاریخی منزل اور اس کے تقاضے سے باخبر ہوں"۔

اب آپ کو معلوم ہو گیا کہ یہ ساری دماغ سوزی اُس سماجی انقلاب (Social Revolution)

کے لیے مسلمانوں کو تیار کرنے کی خاطر کی گئی ہے جس کا نقشہ پنڈت جواہر لال نہرو کے خیالات میں آپ دیکھ چکے ہیں۔ اور یہ دعوت پھیلائی کس اخبار کے ذریعہ سے جا رہی ہے؟ اس اخبار کے ذریعہ سے جو جمعیت علماء ہند کا واحد ترجمان ہے۔ کیسے صحیح راستہ پر جا رہی ہے "یہ آزادی کی فوج"! شردھانند کی شدھی پر شور قیامت برپا تھا۔ جواہر لال کی شدھی شربت کے گھونٹوں کی طرح اتاری جا رہی ہے۔

"آزادی کی فوج" اپنے مسلمان سپاہیوں سے جو خدمت لے رہی ہے ان میں سے دو صاحبوں کے کارنامے آپ نے ملاحظہ فرما لیے۔ ایک صاحب نے اسلامی قومیت پر تیشہ چلایا۔ دوسرے صاحب نے اسلامی تہذیب و تمدن پر ضرب لگائی۔ اب تیسرے سپاہی کا کارنامہ ملاحظہ ہو۔

اخبار "مدینہ" میں اسی "شعبۂ اسلامیات" کے ایک ذمہ دار رکن جناب منظر رضوی صاحب کا ایک طویل مضمون "مسٹر جناح کی کھوکھلی قیادت" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس پر اختلافی نوٹ کے بجائے ادارۂ مدینہ کی جانب سے حسب ذیل تعریفی نوٹ لکھا گیا ہے:۔

"فاضل مقالہ نگار نے جس خوبی کے ساتھ اسلامیان ہند کے سامنے مسائل حاضرہ کو پیش کیا ہے اس کا تقاضہ ہے کہ قارئین مدینہ اس مقالہ کو صبر و سکون کے ساتھ از اول تا آخر مطالعہ فرمائیں۔" ("مدینہ" مورخہ یکم نومبر ۳۷ء)

اب ذرا دیکھیے کہ کس خوبی کے ساتھ اسلامیان ہند کو مسائل حاضرہ سمجھائے جاتے ہیں۔

"ہمارا دوسرا حربہ حکومت اور اس کے حاشیہ بردار زمینداروں، تعلقداروں، جاگیر داروں کی مالگذاری اور لگان بند کرنا ہے ..... لیکن یہ یاد رہے کہ ان پایوں کو گراتے وقت ایک بہت بڑی کرانتی (انقلاب) مچیگی۔ بلوے اور فساد ہوں گے۔ اس میں خونریزیاں بھی ہوں گی۔ خون کی ندیاں بہینگی اور سب کچھ ہوگا۔ اور اس وقت یہ جتنے زمیندار، سرمایہ دار،

پونجی اور کانوں کے مالک، تعلقوں اور جاگیروں کے آقا، یہی راجہ محمود آباد، نواب چھتاری، سر سکندر حیات، راجہ نریندر ناتھ، گھنشام داس برلا، بھائی پرمانند، اور سیٹھ والمیا جو مسلم ملت اور ہندو جاتی کے نعرے لگائے جاتے ہیں اپنی اپنی غریب اور دکھی جنتا اور غریب اور فاقہ مست عوام کو چھوڑ کر برٹش سامراج کے ساتھ ہوں گے اور ان پر گولے اور بم برسائیں گے۔ دوسری طرف غریبوں کی طاقت ہوگی اور اُن کی جیون ساتھی کانگریس"۔

"ہماری آنے والی لڑائی دراصل امیری اور غریبی کی لڑائی ہوگی۔ اس میں ہندوستان بھر کے امیر چاہے وہ کسی مذہب اور فرقے کے کیوں نہ ہوں بدیسی سامراج کے ساتھ ہوں گے اور وہ ہم غریبوں اور مفلسوں کو توڑنے اور تباہ کرنے کے لیے ہر متھیار کو استعمال کریں گے" ..... پھر کسانوں اور مزدوروں کی جاگ سے امیروں کو، راجہ محمود آباد، نواب چھتاری اور سر سکندر جیسے لوگوں کو بہت بڑا خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ زمانہ پلٹا کھانے کو ہے۔ دولت اور امیری ہاتھ سے نکلنے کو ہے، امیروں کو نیچے آنا ہے۔ غریبوں کو اوپر جانا ہے۔ ان سب باتوں کے ڈر سے ہندو جاتی اور مسلم ملت کے یہ ہندو مسلم نام لیوا اپنے اپنے مذہب کے لوگوں کو سامراج مخالف تحریک سے ہٹا کر رکھنا چاہتے ہیں تاکہ یہ لوگ مل کر آخری لڑائی نہ لڑنے پائیں۔ اس لیے قرآن اور حدیث کی آیتیں اور وید اور شاستر کے اشلوک پڑھے جا رہے ہیں"۔

جنگ آزادی کی نوعیت کو اس طرح واضح کرنے کے بعد فاضل مضمون نگار فرماتے ہیں:۔

"مسٹر جناح نے پکار کر کہا ہے "ہندوستان بھر کے مسلمانو ملجاؤ"۔ سوال یہ ہے کہ ہندوستان بھر کا مسلمان آپس میں کیوں ملے؟ اس اتحاد کی ضرورت کیا؟ اس کا مقصد کیا؟ جہاں تک توحید، رسالت، مذہبی معتقدات، اور مذہبی حرکت و عمل کا تعلق ہے وہ آپس میں

ملے ہوئے ہیں۔ بالکل متحد ہیں۔ ان میں کوئی اختلاف نہیں اور ہم مسٹر جناح کو یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ بھی کوئی اختلاف نہ ہوگا۔ لیکن سیاسی اور اقتصادی اغراض و مفاد کے لیے مسلمانوں کا آپس میں ملنا ناممکن ہے۔ وہ ہرگز متحد نہیں ہو سکتے اور نہ ان کو متحد ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کے اغراض اور فائدے بالکل ایک سے نہیں ہیں"۔

"ہندوستان میں امیر اور غریب کے دو طبقے ہیں۔ امیروں کی غرض یہ ہے کہ امیری کے جتنے بھی وسائل ہیں ان پر ان لوگوں کا قبضہ رہے۔ اور غریبوں کی محنت سے وہ فائدہ اٹھاتے رہیں۔ غریبوں کا فائدہ اس میں ہے کہ امیری کے یہ وسیلے ان کے ہاتھ سے چھن جائیں اور ان کا انتظام اس طرح ہو کہ ملک سے غربت دور ہو۔ غربت کو دور کرنے کا سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ دولت کے ان محدود پہلوؤں کو ان کے چنگل سے نکال لیا جائے۔ شخصی ملکیت کو ختم کیا جائے۔ ..... یہ عام اور اصولی بات ہے۔ اب ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کا فائدہ کیا ہے؟ مسلمانوں میں بھی کچھ امیر ہیں اور کچھ غریب، سب کی ایک ہی حالت نہیں ہے۔ مسلمانوں کے تھوڑے سے لوگ امیر ہیں۔ جو شائد زیادہ سے زیادہ ایک کروڑ ہوں گے۔ سات کروڑ مسلمان محنت سے روٹی حاصل کرتے ہیں.... ...جب تک پونجی شاہی دولت کی پیداوار اور تقسیم کے طریقوں کو ہم متذکرہ بالا انقلابات سے غارت نہیں کرتے ان کے روزگار کا کوئی انتظام نہیں ہو سکتا..... اس کے خلاف وہ ایک کروڑ مسلمان بھی ہیں جن کے پاس زمین، جائداد، کارخانے اور کان ہیں۔ ان کی جیبوں میں بڑی بڑی سرکاری ملازمتیں ہیں۔ وہ سکھ اور چین کی زندگی بسر کرتے ہیں اور مزے اڑاتے ہیں۔ اب ان سات کروڑ غریب مسلمانوں کو ایک کروڑ امیر مسلمانوں سے ملنے کے لیے کہا جاتا ہے"۔

"خیر" تو عام مسلمانوں کے حقوق اور مفاد عام ہندوؤں سے جدا نہیں ہیں خود مسلم ملت کے حقوق و مفاد باہم دگر متضاد اور مختلف ہیں ان میں کوئی یگانگت نہیں ..
..... مختصر یہ کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھی ہمارے مفاد آپس ہی میں بالکل مختلف ہیں"

فی الواقع مسائل حاضرہ کو ان سطور میں "بڑی خوبی" کے ساتھ پیش کیا گیا ہے! مگر ایسی خوبی کے ساتھ ان مسائل کو صرف وہی لوگ پیش کر سکتے ہیں اور ایسی گرمجوشی کے ساتھ ان کی داد بھی وہی لوگ دے سکتے ہیں جنھیں تعلیم قرآن کی ہوا تک نہ لگی ہو، یا جنہوں نے اِتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا کے مصداق قرآن حکیم کو ایک دور از کار شے سمجھ کر بالائے طاق رکھ دیا ہو۔

انگریزی سامراج کے مقابلہ میں ان لوگوں کا نقشۂ جنگ خود انہی کی زبان سے آپ نے سن لیا۔ یہ چاہتے ہیں کہ اس سامراج کے قلعے کو ڈھانے کے لیے اشتراکی انقلاب برپا کریں۔ اشتراکی انقلاب برپا کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ پہلے نادار لوگوں کو بلا امتیاز دین و ملت ایک گروہ بنایا جائے، اور مالدار لوگوں کو بلا امتیاز دین و ملت ایک دوسرا گروہ بننے پر مجبور کیا جائے۔ پھر پہلے گروہ میں دوسرے گروہ کے خلاف نفرت، حسد، اور بغض کی اتنی آگ پھونکی جائے کہ وہ کرانتی مچانے اور لوٹ مار کا بازار گرم کرنے اور خون کی ندیاں بہانے پر آمادہ ہو جائے۔ یہ کام جب پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا، اور اس قسم کی کرانتی سارے ہندوستان میں مچ جائے گی، تب کہیں سامراج کا قلعہ منہدم ہو گا، یا زیادہ صحیح الفاظ میں تب وہ ہتھیار تیار ہو گا جس سے یہ حضرات اس قلعے کی جڑوں پر ضرب لگانا چاہتے ہیں — اب اگر آپ اسلام کی حقیقت سے واقف ہیں اور امت مسلمہ کے نظام ترکیبی کو تھوڑا بہت بھی جانتے ہیں تو یہ سمجھنا آپ کے لیے کچھ مشکل نہیں کہ اس طریق جنگ سے سامراج کا استیصال تو بعد میں ہوتا رہے گا، پہلے تو اسلام کا استیصال بحیثیت ایک نظام اجتماعی کے، اور امت مسلمہ کا استیصال بحیثیت ایک قوم کے

مکمل ہو جائے گا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو حقیقت سے قریب تر ہوگا کہ جس ہتھیار سے یہ لوگ انگریزی سامراج کا قلعہ ڈھانا چاہتے ہیں وہ اس وقت تک تیار ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ اسلام کے قصر کو مسمار کر کے اس کا مسالہ اس ہتھیار کی تیاری میں صرف نہ کر دیا جائے۔

پنڈت جواہر لال کے جو خیالات آپ ماہ رمضان کے "اشارات" میں پڑھ چکے ہیں انھیں سامنے رکھیے اور اس کے بعد ڈاکٹر محمود، ڈاکٹر اشرف اور منظر رضوی صاحبان کے ان ارشادات کو علی الترتیب پڑھیے تب آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ آزادی کی فوج کس طرح بنائی جا رہی ہے، کس طرح اس کی تشکیل میں خود مسلمانوں سے کام لیا جا رہا ہے اور اس کے کیا نتائج مسلمانوں پر مترتب ہونے والے ہیں۔

ان کا پہلا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے دماغ سے اسلامی قومیت کا خیال نکال دیں۔ یہ ہندوستان کی تمام آبادی کو "ایک قوم" بنانا چاہتے ہیں؛ اس لیے مسلمانوں کی مستقل قومیت کو فنا کر دینا ان کے نزدیک ہندوستان جدید کی تعمیر کے لیے ناگزیر ہے۔

ان کا دوسرا حملہ اسلامی تہذیب و تمدن پر ہے۔ ہندوستان کی آبادی ایک قوم نہیں بن سکتی جب تک کہ سب ایک تہذیب اور ایک تمدن کو اختیار نہ کر لیں۔ اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مسلمانوں کی جداگانہ تہذیب ہے؛ اسی کو دور کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے اور خود مسلمانوں کی زبان سے کہلوایا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کی کوئی علیحدہ تہذیب ہے ہی نہیں۔ تمدن کی مختلف صورتیں وہ ہمیشہ اختیار کرتے رہے ہیں؛ اور اب اس صورت کو بھی قبول کر لینے میں کوئی حرج نہیں جو "زمانے کے شدید انقلاب انگیز تقاضوں" سے پیدا ہو رہی ہے۔

ان کا تیسرا حملہ اسلام کے نظام اجتماعی پر ہے اور یہ سب سے زیادہ خطرناک حملہ ہے کیونکہ یہی حملہ مسلمانوں کو قرآنی مذہب کے دائرے سے نکال کر اشتراکی مذہب میں شامل کر دیتا ہے۔ مسلمانوں کی

عظیم اکثریت بھوک اور افلاس میں مبتلا ہے اور اس کے ساتھ اپنے مذہب سے جاہل بھی ہے۔ اس انبوہ کثیر میں اگرچہ اتنی عقل ضرور ہے کہ اگر اس سے علانیہ تبدیل مذہب کے لیے کہا جائے تو شائد وہ مرنے اور مارنے کے لیے تیار ہو جائے، مگر اتنے ہوشمند یہ لوگ نہیں ہیں کہ اشتراکیت کے نتائج کو سمجھ سکیں۔ ان کے سامنے جب یہ کہا جائیگا کہ آؤ ہم تمہاری بھوک کے مسئلے کو حل کیے دیتے ہیں، تو یہ بیچارے ٹڈی دل کی طرح اُس ملک کی طرف ٹوٹ پڑیں گے جس میں ان کو پیٹ کی آگ بجھانے کا سامان نظر آئے گا۔ یہاں ان سے کہا جائے گا کہ تمہارے اصلی بھائی وہ غیر مسلم عوام ہیں جو تمہاری طرح بھوک کی تکلیف میں مبتلا ہیں، اور تمہارے اصلی دشمن وہ مسلمان ہیں جو کسی زمین یا مکان یا کارخانے کے مالک ہیں، یا جن کے پاس تم سے کچھ زیادہ وسائل معیشت موجود ہیں، آؤ اپنے غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ مل کر ان مسلمان دشمنوں سے لڑو۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ سات کروڑ جاہل اور مفلس مسلمان، اعلیٰ اور متوسط طبقوں کے اُن ایک کروڑ مسلمانوں سے نہ صرف علیحدہ بلکہ برسرِ جنگ ہو جائیں گے، جو ہندوستان میں اسلامی تہذیب کو بہرحال کسی نہ کسی حد تک سنبھالے ہوئے ہیں اور جن کے پاس کسی نہ کسی حد تک اسلامی شریعت کا علم محفوظ ہے (یہاں یہ یاد رہے کہ ان ایک کروڑ مسلمانوں میں سب کے سب تعلقدار اور جاگیردار، راجہ محمود آباد اور نواب چھتاری نہیں ہیں اور نہ سب بدیسی سامراج کے ساتھی ہیں بلکہ ان میں مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا حسین احمد صاحب اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جیسے لوگ بھی ہیں اور ہمارے متوسط طبقے کی عظیم اکثریت ایسے ہی لوگوں پر مشتمل ہے) اس قسم کی علیحدگی اور دشمنی پیدا ہو جانے کے بعد کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ ان دونوں طبقوں کے مسلمان مذہبی معتقدات اور مذہبی حرکت و عمل میں ایک دوسرے سے ملے رہیں۔ جن کے درمیان روٹی کی لڑائی چھڑ گئی ہو، کیا وہ مسجدوں میں مل کر نماز پڑھ سکتے ہیں؟ جن کے دلوں میں بغض و حسد کی آگ بھڑکا دی گئی ہو، کیا وہ اپنے پیٹ کے دشمنوں کو اپنا دینی بھائی سمجھ سکتے ہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ مالدار مسلمان اپنے اس ہمسایہ کو زکوٰۃ دے جس کے متعلق اسے یقین ہے کہ وہ اس کی جائداد لوٹنے کی فکر میں

لگا ہوا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ مفلس طبقہ کے عوام، متوسط تعلیم یافتہ طبقے کے لوگوں سے اُس مذہب کے معتقدات اور احکام سن کر قبول کریں گے جو صاف طور پر شخصی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے، حلال طریقوں سے کمائی ہوئی دولت کو کمانے والے کا حق قرار دیتا ہے، اور اس شخص کو مفسد اور ڈاکو سمجھتا ہے جو ایسی دولت کو چھیننے کے لیے ہاتھ بڑھائے؟ پس یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے درمیان معاشی نزاع اور طبقات کی جنگ برپا ہو جانے کے بعد دینی اخوت کا رشتہ کسی طرح باقی ہی نہیں رہ سکتا، اور یہ رشتہ ٹوٹ جانے کے بعد جو سات کروڑ جاہل مفلس مسلمان اپنے سے دوگنی بلکہ تگنی تعداد کے غیر مسلموں میں گھل مل جائینگے جن میں یہ احساس پیدا کیا جائے گا کہ ان کے اصلی بھائی یہی غیر مسلم ہیں، اور جن کو اشتراکی اصول و عقائد کے مطابق ٹریننگ دی جائے گی انھیں کوئی چیز دائرۂ اسلام سے نکلنے اور غیر اسلامی قومیت میں جذب ہو جانے سے نہیں بچا سکتی۔

فرمائیے اس تحریک کو اگر میں "شدھی" سے تعبیر کرتا ہوں تو کیا غلطی کرتا ہوں۔ کیا فرق ہے اس شدھی میں اور شردھانند والی شدھی میں؟ مسلمان جب اسلام سے منحرف ہو گیا اور اسلامی قومیت سے نکل گیا تو ہمارے لیے یکساں ہے خواہ وہ ہندومت میں جائے یا کسی اور مت میں۔ البتہ اگر فرق ہے تو یہ کہ شردھانند کی شدھی ایک کھلی ہوئی چیز تھی، اس کا داعی صاف کہتا تھا کہ میں تمہیں اسلام سے نکالنا چاہتا ہوں، ہر وہ شخص اس سے بچ سکتا تھا جو کفر سے بچنا چاہتا ہو، اور کسی طرح یہ ممکن ہی نہ تھا کہ مسلمان اس شدھی میں خود مددگار بن جاتے بخلاف اس کے یہ شدھی ایسی ہے کہ اس کا نام "آزادی کی جنگ" جیسا قابل عزت نام ہے۔ اس میں خود مسلمانوں سے، ان کے مقرروں سے، انشاپردازوں سے، لیڈروں سے، ایڈیٹروں سے، حتّٰی کہ ان کے علما تک سے حسب حیثیت کام لیا جا رہا ہے، اور ہزاروں مسلمان اس کی طرف بگ ٹٹ چلے جا رہے ہیں بغیر اس کے کہ انھیں اس امر کا شعور ہو کہ وہ دراصل شدھی کے

راستے پر جا رہے ہیں۔

یہ ہے اس جنگ آزادی کی حقیقت جس سے علیحدہ رہنے پر "قوم پرست" ہی نہیں بلکہ ہمارے "دین پرست" بھائی اور ہمارے دین کے علمبردار علماء تک مسلمانوں کو بزدلی اور ٹوڈیت اور سرکار پرستی کے طعنے دے رہے ہیں۔ ان حضرات پر کانگریسی پریس کے پروپیگنڈا اور جواہر لال کے مصنوعی الفاظ کا جادو چڑھ گیا ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ "آزادی کی جنگ" فی نفسہٖ ایک مقدس جہاد ہے جس میں شریک ہونا ہر مسلمان کا "فرض" ہے ــــ "فرض" کے لفظ کو یاد رکھیے کیونکہ مولانا ابوالکلام جیسے عالم دین نے فرائض کی فہرست میں اس نئے فرض کا اضافہ فرمایا ہے ــــ حالانکہ درحقیقت یہ آزادی مسلمانوں کے لیے آزادی نہیں ہے، بلکہ ان کی قومیت، ان کی تہذیب اور ان کے نظام اجتماعی کی کامل بربادی ہے، اور اُس کام کی تکمیل ہے جسے ڈیڑھ سو برس پہلے انگریزی امپیریلزم نے شروع کیا تھا۔ ایسی آزادی کے لیے لڑنا ہرگز مسلمانوں کا فرض نہیں ہے۔ قرآن سے، حدیث سے، اور عقل سے، غرض کسی معیار حق و صداقت سے بھی اس احمقانہ فعل کو فرض ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ "فرض" تو درکنار، میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں کو ایسی جنگ سے دلچسپی یا ہمدردی رکھنے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس ان پر دین اور عقل سلیم دونوں کی طرف سے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اپنے قومی وجود اور اپنی تہذیب کو تباہی سے بچانے کے لیے اجتماعی جدوجہد اور سرفروشانہ جنگ پر آمادہ ہو جائیں۔

آزادی کی یہ نام نہاد جنگ صرف انگریزی امپیریلزم ہی کے خلاف نہیں ہے جس کے ہم اور جواہر لال دونوں یکساں دشمن ہیں، بلکہ ساتھ ہی ساتھ یہ اُس قومیت، اس تہذیب اور اس نظام اجتماعی کے خلاف بھی جنگ ہے جس کو ہم دنیا میں ہر چیز سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور جواہر لال اپنے ہندوستان

جدید کی تعمیر میں سدراہ سمجھتے ہیں۔ جو ہر لال ہمارے اور اپنے مشترک دشمن سے لڑنے کے لیے جا رہے ہیں لیکن اس لڑائی کے لیے طریقہ وہ اختیار کرتے ہیں جو مشترک دشمن کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے بھی پہلے خود ہمارا استیصال کر دیتا ہے۔ جب ایسی لڑائی میں ہم ان کے ساتھ شریک ہونے سے انکار کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ تم رجعت پسند ہو، ترقی دشمن ہو اور سامراج کے حامی ہو ۔ مطلب یہ ہے کہ ترقی بس اُسی چیز کا نام ہے جسے جواہر لال ترقی کہتے ہیں، اور اس کی مخالفت کرنا رجعت پسندی ہے۔ سامراج کی جڑ کھودنے کا بس یہی ایک طریقہ ہے کہ ہم اس کے ساتھ اپنی جڑ بھی کھود ڈالیں، اور اس طریقہ سے انحراف کرنا گویا سامراج کی حمایت کرنا ہے۔ سامراج کو انہوں نے ہمارے لیے ایک ھوّا بنایا ہے جس سے ڈرا ڈرا کر وہ ہم کو اُس راستہ کی طرف دھکیلنا چاہتے ہیں جس میں ہماری ہستی ہی فنا ہو جاتی ہے۔ انہوں نے مصنوعی الفاظ، جھوٹے پروپیگنڈا، اور پرفریب مظاہرات کا ایک جال بچھایا ہے جو بدترین ذہنی استبداد کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ وہ لوگوں پر اپنی مرضی کو جبراً مسلط کر رہے ہیں اور جو کوئی ان کے استبداد کی اطاعت کرنے سے انکار کرتا ہے اس پر اپنے بنا دٹی الفاظ ــ رجعت پسندی، فرقہ پرستی، ترقی دشمنی اور سامراج پرستی ــ کی بارش کرتے ہیں تاکہ اس کی آواز بے اثر ہو جائے۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو سامراج پرستی کے اصلی مجرم وہ خود ہیں، کیونکہ سامراج سے لڑنے کے لیے انہوں نے وہ طریقہ اختیار کیا ہے جس کو ہندوستان کی ۱/۴ آبادی کسی طرح قبول نہیں کر سکتی۔ اس غلط اور احمقانہ طریقہ سے وہ خود سامراج کی مدد کر رہے ہیں اور پھر طعنہ ہم کو دیتے ہیں کہ تم سامراج کے حامی ہو، حالانکہ ہم سامراج کے حامی نہیں بلکہ شدید ترین دشمن ہیں مگر ایسے احمق دشمن نہیں کہ برائے شگون کے لیے اپنی ناک کاٹنے پر آمادہ ہو جائیں۔